رُوح

آریہ صاحبوں کا اعتقاد ہے کہ پرمیشر نے کوئی رُوح پیدا نہیں کی بلکہ کل ارواح انادی اور قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔ ایسا ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مکتی یعنی نجات ہمیشہ کے لئے انسان کو نہیں مل سکتی بلکہ ایک مدت مقررہ تک مکتی خانہ میں رکھ کر پھر اس سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اب ہمارا اعتراض یہ ہے کہ یہ دونوں اعتقاد ایسے ہیں کہ ایک کے قائم ہونے سے تو خدائے تعالیٰ کی توحید بلکہ اُس کی خدائی ہی دُور ہوتی ہے اور دوسرا اعتقاد ایسا ہے کہ بندہ وفادار پر ناحق کی سختی ہوتی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر تمام ارواح کو اور ایسا ہی اجزاء صغار اجسام کو قدیم اور انادی مانا جائے تو اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک تو یہ کہ اس صورت میں خدا تعالیٰ کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس حالت میں بقول آریہ صاحبان ارواح یعنی جیو خود بخود موجود ہیں۔ اور ایسا ہی اجزاء صغار اجسام بھی خود بخود ہیں تو پھر جوڑنے جاڑنے کیلئے ضرورت صانع کی ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ ایک دہریہ جو خدا تعالیٰ کا منکر ہے عذر پیش کر سکتا ہے کہ جس حالت میں تم نے کل چیزوں کا وجود خود بخود بغیر ایجاد پرمیشر کے آپ ہی مان لیا ہے تو پھر اس بات پر کیا دلیل ہے کہ ان چیزوں کے باہم جوڑنے جاڑنے کے لئے پرمیشر کی حاجت ہے؟ دوسری یہ قباحت کہ ایسا اعتقاد خود خدائے تعالیٰ کو اُس کی خدائی سے جواب دے رہا ہے۔ کیونکہ جو لوگ علم نفس اور خواص ارواح سے واقف ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جس قدر ارواح میں عجائب و غرائب خواص بھرے ہوئے ہیں وہ صرف جوڑنے جاڑنے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً رُوحوں میں ایک قوت کشفی ہے جس سے وہ پوشیدہ باتوں کو بعد مجاہدات دریافت کر سکتے ہیں۔ اور ایک قوت ان میں عقلی ہے جس سے وہ امور عقلیہ کو معلوم کر سکتے ہیں۔ ایسا ہی ایک قوت محبت بھی ان میں پائی جاتی ہے جس سے وہ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں۔ اگر ان تمام قوتوں کو خود بخود بغیر ایجاد کسی موجد کی مان لیا جائے تو پرمیشر کی اِس میں بڑی ہتک عزت ہے گویا یہ کہنا پڑے گا کہ جو عمدہ اور اعلیٰ کام تھا وہ خود بخود ہے اور جو ادنیٰ اور ناقص کام تھا وہ پرمیشر کے ہاتھ سے ہوا ہے۔ اور اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ جو خود بخود عجائب حکمتیں پائی جاتی ہیں وہ پرمیشر کے کاموں سے کہیں بڑھ کر ہیں ایسا کہ پرمیشر بھی اُن سے حیران ہے۔ غرض

اِس اعتقاد سے آریہ صاحبوں کے خدا کی خدائی پر بڑا صدمہ پہنچیگا۔ یہاں تک کہ اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا اور اس کے وجود پر کوئی عقلی دلیل قائم نہ ہوسکیگی۔ اور نیز وہ مبدأ کل فیوض کا نہیں ہو سکیگا بلکہ اس کا صرف ایک ناقص کام ہوگا اور جو اعلیٰ درجہ کے عجائب کام ہیں اُن کی نسبت یہی کہنا پڑیگا کہ وہ سب خود بخود ہیں۔ لیکن ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو اس سے اگر فرضی طور پر پرمیشر کا وجود مان بھی لیا جائے تب بھی وہ نہایت ضعیف اور نکما سا وجود ہوگا جس کا عدم وجود مساوی ہوگا یہاں تک کہ اگر اُس کا مرنا بھی فرض کیا جائے تو روحوں کا کچھ بھی حرج نہ ہوگا اور وہ اس لائق ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی رُوح اُس کی بندگی کرنے کے لئے مجبور کی جائے کیونکہ ہر ایک رُوح اس کو جواب دے سکتی ہے کہ جس حالت میں تم نے مجھے پیدا ہی نہیں کیا اور یہ میری طاقتوں اور قوتوں اور استعدادوں کو تم نے بنایا تو پھر آپ کس استحقاق سے مجھ سے اپنی پرستش چاہتے ہیں؟ اور نیز جب کہ پرمیشر رُوحوں کا خالق ہی نہیں تو اُن پر محیط بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب احاطہ نہ ہو سکا تو پرمیشر اور روحوں میں حجاب ہوگیا۔ اور جب حجاب ہوا تو پرمیشر سرب گیانی نہ ہوسکا یعنی علم غیب پر قادر نہ ہوا۔ اور جب قادر نہ رہا تو اس کی سب خدائی درہم برہم ہوگئی تو گویا پرمیشری ہاتھ سے گیا۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ علم کامل کسی شئے کا اس کے بنانے پر قادر کردیتا ہے۔ اسی لئے حکماء کا مقولہ ہے کہ جب علم اپنے کمال تک پہنچ جائے تو وہ عین عمل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں بالطبع سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پرمیشر کو رُوحوں کی کیفیت اور کنہ کا پورا پورا علم بھی ہے یا نہیں؟ اگر اس کو پورا پورا علم ہے تو پھر کیا وجہ باوجود پورا پورا علم ہونے کے پھر ایسی ہی رُوح بنا نہیں سکتا؟ سو اس سوال پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ پرمیشر رُوحوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ اُن کی نسبت پورا پورا علم بھی نہیں رکھتا۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۹۱-۹۳)

آریہ صاحبوں کا وید ایک ایسا خدا بتا رہا ہے جس سے حق جُو آدمی ضرور ہے کہ نفرت کرے وہ اپنے پرمیشر کو اپنی بادشاہی کا خود موجب نہیں سمجھتے بلکہ ایسا خیال کرتے ہیں کہ وہ بادشاہت کسی بخت و اتفاق سے اُسے مل ہے یعنی اس کی خوش قسمتی سے چند ارواح اور اجسام بنے بنائے اُس کو مل گئے ہیں اور شاید ابھی ارواح اور اجسام کا کوئی اور دفینہ بھی کسی جگہ پوشیدہ ہو جس کی ہنوز پرمیشر کو اطلاع نہیں ہوئی۔ مگر کیا یہ ایسا اعتقاد ہے جس کو عظمت و قدرت و شان کبریائی حضرت اللہ جلّ شانہٗ کے مطابق کہہ سکتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ وہ کامل ذات ہے جس کو تمام فیوض کا مبدء

اور تمام انوار کا سرچشمہ اور تمام چیزوں کا قیوم اور تمام خوبیوں کا جامع اور تمام کمالات کا مستجمع اور عجز اور نقص اور احتیاج الی الغیر سے پاک ہے۔ لیکن تم سوچ کر دیکھو کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ارواح اور اجسام کے غیر مخلوق اور خود بخود ماننے سے ان تمام صفات کاملہ الٰہیہ میں سے کوئی بات بھی قائم نہیں رہ سکتی اور ایک ایسا سخت صدمہ اس کی شان خدائی پر پہنچتا ہے کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

ایک ادنیٰ درجہ کی عقل بھی سمجھ سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے **ایک** ہونے کے یہی معنے ہیں کہ **درحقیقت وجود اسی کا وجود ہے** اور باقی سب چیزیں اُس سے نکلی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ قائم اور اسی کے رشحات فیض سے اپنے کمالات مطلوبہ تک پہنچتی ہیں۔ مگر افسوس کہ آریوں کا علم الٰہی اِس کے برخلاف بتلا رہا ہے۔ ان کی کتابیں انہی واویلوں سے پُر ہیں کہ ہم بھی پرمیشر کی طرح قدیم اور غیر مخلوق اور انادی اور اس کی مشابہ اور اپنے اپنے وجود کے آپ خدا ہیں۔ نہیں سوچتے کہ اگر وہ بھی قدیم الذات اور قائم بذاتہٖ اور واجب الوجود ہیں تو پھر خدا جیسے ہو کر اس کی ماتحت کیوں ہو گئے؟ اور کس نے درمیان میں ہو کر دونوں میں تعلّق پیدا کر دیا ....

یہ بات ایک لڑکا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر سب ارواح اور اجسام خود بخود پرمیشر کی طرح قدیم اور انادی ہیں اور اپنے اپنے وجود کے آپ ہی خدا ہیں تو پرمیشر اس دعویٰ کا ہرگز مجاز نہیں رہا کہ مَیں ان چیزوں کا رب اور پیدا کنندہ ہوں کیونکہ جبکہ ان چیزوں نے پرمیشر کے ہاتھ سے وجود ہی نہیں لیا تو پھر ایسا پرمیشر ان کا ربّ اور مالک کیونکر ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ بنا بنایا آسمان سے گرے یا زمین کے خمیر سے خود پیدا ہو جائے تو کسی عورت کو یہ دعویٰ ہرگز نہیں پہنچتا کہ یہ میرا بچہ ہے بلکہ اس کا بچہ وہی ہو گا جو اس کے پیٹ سے نکلا ہے۔ سو **جو خدا کے ہاتھ سے نکلا ہے وہی خدا کا ہے**۔ اور جو اس کے ہاتھ سے نہیں نکلا وہ اس کا کسی طور سے نہیں ہو سکتا۔ کوئی صالح اور بھلا مانس ایسی چیزوں پر ہرگز قبضہ نہیں کرتا جو اس کے نہ ہوں تو پھر کیونکر آریوں کے پرمیشر نے ایسی چیزوں پر قبضہ کر لیا جن پر قبضہ کرنے کا اس کو کوئی استحقاق نہیں۔ سو سوچنا چاہیئے یہ بات کس قدر مکروہ اور دُور از حقانیت ہے کہ مالک الخلق اور ربّ العالمین کو اُس کی مخلوقات سے جواب دیا جاتا ہے۔ اور جو اصل حقیقت خدائی کی ہے اُس سے اسکو الگ کیا جاتا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۹۶-۹۸)

بعض آریہ سماج والے ارواح کے غیر مخلوق اور اپنے وجود کے آپ خدا ہونے کے بارے میں یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ اگر ارواح کسی وقت معدوم تھیں اور پھر خدائے تعالیٰ کے پیدا کرنے سے

موجود ہوئی تو گویا **نیست سے ہست ہوگیا** اور نیستی سے ہستی ہونا ایسی دُور از فہم بات ہے کہ کوئی عقلمند اس کو نہیں مانے گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یوں تو فاسد اور ناقص عقل کے مارے ہوئے خدا تعالیٰ کو بھی نہیں مانتے۔ لیکن جس شخص کی عقل سلیم ہے اس کو تو خدا تعالیٰ کے ماننے کے ساتھ ہی اس کی وہ تمام صفات بھی ماننے پڑیں گے جو مدار اس کی خدائی اور الوہیت کے ہیں۔ اور جو شخص خدائے تعالیٰ کی اس نہایت ضروری صفت کو مان لیگا کہ وہ قادرِ مطلق اور بے انتہا طاقتوں کا مالک ہے تو پھر ہرگز اس کی قدرتوں کو اپنی عقل ناقص کے ساتھ موازنہ نہیں کرے گا۔ اور خدائے غیر محدود کی قادرانہ قوتوں کو کسی حدّ خاص میں محدود نہیں جانے گا۔ اور نیز جب ایک عقلمند دیکھیگا کہ خدائے تعالیٰ ایسا اپنی ذات میں مظہر العجائب و بلند تر از احاطۂ فکر و قیاس ہے جو بغیر اسباب آنکھوں کے دیکھتا ہے اور بغیر اسباب کانوں کے سُنتا ہے اور بغیر اسباب زبان کے بولتا ہے اور بغیر حاجت معماروں و مزدوروں و نجاروں و آلات عمارت سازی و فراہمی اینٹوں و پتھروں وغیرہ کے صرف اپنے ارادہ اور حکم کے اشارہ سے ایک طرفۃ العین میں زمین و آسمان بنا سکتا ہے تو بے شک اس بات کا یقین بھی کرے گا کہ وہ قادر خدا نیستی سے ہستی بھی کر سکتا ہے۔ یہی تو خدائی ہے اِسی وجہ سے تو وہ سرب شکتی مان اور قادرِ مطلق اور غیر متناہی قدرتوں کا مالک کہلاتا ہے۔ اگر اس کے کام بھی انسانی کاموں کی طرح محتاج باسباب و مواد و اوقات ضروریہ ہوں تو پھر وہ کاہے کا خدا ہوا۔ اور اس کی خدائی کیونکر چل سکے؟ کیا اس کے تمام کام بالاتر از عقل نہیں ہیں؟ کیا اس کی عجائب قدرتیں ایسی نہیں ہیں کہ ان پر نظر ڈال کر عقل ناقص انسانی خیرہ رہ جاتی ہے؟ تو پھر کیسی جہالت ہے کہ جو بات اس کی خدائی کا مدار اور اُس کی الوہیت کی حقیقت ہے اسی پر اعتراض کیا جائے ....

ایسا پرمیشر کس بات کا پرمیشر ہے کہ اگر وہ کسی اپنے امر متخیل کو کہے کہ ہو جا تو کچھ بھی نہ ہو۔ خدا تو اس ذات عجیب القدرت کا نام ہے کہ جو اس کے ارادہ سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے کسی امر مقصود کو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ فی الفور اس کی قدرت کاملہ سے نقش وجود پکڑ جاتا ہے۔ یہ راز نہایت دقیق معرفت کا نکتہ ہے کہ **سب مخلوقات کلمات الٰہیہ** ہیں۔ عیسائیوں نے جب اپنی نادانی سے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں یعنی ان کی رُوح کلمہ الٰہی ہے جو متشکل بروح ہو گئی ہے تو خدائے تعالیٰ نے اس کا یہ حقانی جواب دیا کہ کوئی بھی ایسی رُوح نہیں جو کلمۃ اللہ نہ ہو اور مجرد الٰہی حکم سے نہ نکلی ہو قل الرّوح من امر ربّی

اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بات جو کلمات اللہ بصورت ارواح و دیگر مخلوق جلوہ گر ہو جاتی ہیں یہ خالقیت کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے اور اسرار الٰہیہ میں سے ایک باریک نکتہ ہے جس کی طرف کسی انسانی عقل کو خیال نہیں آیا اور خدائے تعالیٰ کے پاک اور کامل کلام نے اس کو اپنے الٰہی نور سے منکشف کیا ہے۔ اور اگر ایسا نہ مانا جائے کہ خدائے تعالیٰ اپنے ہی کلمہ اور امر سے ارواح و اجسام کو ظہور پذیر کر لیتا ہے تو پھر آخر یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک باہر سے اجسام اور رُوحیں نہ آویں پرمیشر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مگر کیا ایسا کمبخت پرمیشر ہو سکتا ہے کہ جو درحقیقت اپنے گھر سے تو دیوالیہ اور مفلس اور تہیدست ہے لیکن کسی عارضی اتفاق سے اس کی خدائی کا دھندا چل رہا ہو۔ اگر پرمیشر ایسا ہی ہے تو سب اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور ایسے پرمیشر پر بھروسہ کرنا بھی بڑا معرض خطر ہوگا۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۱۵ - ۱۱۷)

قرآن شریف کہتا ہے کہ روحیں انادی اور غیر مخلوق نہیں

اور دو نطفوں کی ایک خاص ترکیب سے وہ پیدا ہوتی ہیں اور یا دوسرے کیڑے مکوڑوں میں ایک ہی مادہ سے پیدا ہو جاتی ہیں اور یہی سچ ہے۔ کیونکہ مشاہدہ اس پر گواہی دیتا ہے جس کے ماننے کے بغیر چارہ نہیں اور امور محسوسہ مشہودہ سے انکار کرنا سراسر جہالت ہے۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ روح نیست سے ہست ہوتا ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اوّل وہ کچھ بھی نہیں تھا بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کے لئے کوئی ایسا مادہ نہیں تھا کہ انسان اپنی قوت سے اس میں سے رُوح نکال سکتا اور اس کی پیدائش صرف اس طور سے ہے کہ محض الٰہی قوت اور حکمت اور قدرت کسی مادہ میں سے اس کو پیدا کر دیتی ہے۔ اسی واسطے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ رُوح کیا چیز ہے تو خدا نے فرمایا کہ تو ان کو جواب دے کہ رُوح میرے رب کے امر میں سے ہے۔ اس بارے میں آیت قرآنی یہ ہے کہ:۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ یعنی یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا چیز ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ ان کو جواب دے کہ رُوح میرے ربّ کے امر سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک رازِ قدرت ہے اور تم لوگ رُوح کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے مگر تھوڑا سا۔ یعنی صرف اس قدر کہ تم رُوح کو پیدا ہوتے دیکھ سکتے ہو اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ ہم بچشم خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری آنکھ کے سامنے کسی مادہ میں سے کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور انسانی رُوح کے پیدا ہونے کے لئے خدا تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ دو نطفوں کے

ملنے کے بعد جب آہستہ آہستہ قالب تیار ہو جاتا ہے تو جیسے چند ادویّہ کے ملنے سے اُس مجموعہ میں ایک خاص مزاج پیدا ہو جاتی ہے کہ جو اُن دواؤں میں فرد فرد کے طور پر پیدا نہیں ہوتی۔ اِسی طرح اس قالب میں جو خون اور دو نطفوں کا مجموعہ ہے ایک خاص جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک فاسفرس کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور جب تجلّی الٰہی کی ہوا کُن کے امر کے ساتھ اُس پر چلتی ہے تو یکدفعہ وہ افروختہ ہو کر اپنی تاثیر اس قالب کے تمام حصّوں میں پھیلا دیتا ہے تب وہ جنین زندہ ہو جاتا ہے۔ پس یہی افروختہ چیز جو جنین کے اندر تجلّی ربّی سے پیدا ہو جاتی ہے اُسی کا نام رُوح ہے اور وہی کلمۃ اللہ ہے۔ اور اس کو امر ربّی سے اسلئے کہا جاتا ہے کہ جیسے ایک حاملہ عورت کی طبیعت مدبرہ بحکم قادر مطلق تمام اعضاء کو پیدا کرتی ہے۔ اور عنکبوت کے جالے کی طرح قالب کو بناتی ہے۔ اس رُوح میں اس طبیعت مدبرہ کو کچھ دخل نہیں۔ بلکہ رُوح محض خاص تجلّی الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور گو رُوح کا فاسفرس اس مادہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ روحانی آگ جس کا نام رُوح ہے وہ بجز مسّ نسیم آسمانی کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ سچا علم ہے جو قرآن شریف نے ہمیں بتلایا ہے۔ تمام فلاسفروں کی عقلیں اس علم تک پہنچنے سے بیکار ہیں۔

(چشمۂ معرفت ص۱۵۰-۱۵۲)

نجات کا تمام مدار خدا تعالیٰ کی محبت ذاتیہ پر ہے۔ اور محبتِ ذاتیہ اُس محبت کا نام ہے جو رُوحوں کی فطرت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مخلوق ہے پھر جس حالت میں ارواح پرمیشر کی مخلوق ہی نہیں ہیں تو پھر ان کی فطرتی محبت پرمیشر سے کیونکر ہو سکتی ہے۔ اور کب اور کس وقت پرمیشر نے ان کی فطرت کے اندر ہاتھ ڈال کر یہ محبت اس میں رکھدی۔ یہ تو غیر ممکن ہے۔ وجہ یہ کہ فطرتی محبت اس محبّت کا نام ہے جو فطرت کے ساتھ ہمیشہ سے لگی ہوئی ہو۔ اور پیچھے سے لاحق نہ ہو۔ جیسا کہ اسی کی طرف اللہ تعالےٰ قرآن شریف میں یہ اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ اس کا یہ قول ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔ یعنی میں نے روحوں سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا پیدا کنندہ نہیں ہوں تو رُوحوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔

اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسانی رُوح کی فطرت میں یہ شہادت موجود ہے کہ **اس کا خدا پیدا کنندہ** ہے۔ پس رُوح کو اپنے پیدا کنندہ سے طبعًا و فطرتًا محبت ہے اس لئے کہ وہ اُسی کی پیدائش ہے۔ اور اسی کی طرف اس دوسری آیت میں اشارہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یعنی رُوح کا خدائے واحد لاشریک کا طلبگار ہونا اور بغیر خدا کے وصال کے کسی چیز سے تسلّی نہ پانا یہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ یعنی خدا نے اس خواہش کو انسانی رُوح میں پیدا کر رکھا ہے جو انسانی رُوح کسی چیز سے تسلّی اور سکینت بجز وصال الٰہی کے نہیں پا سکتی پس اگر انسانی رُوح

میں یہ خواہش موجود ہے تو ضرور ماننا پڑتا ہے کہ رُوح خدا کی پیدا کردہ ہے جس نے اس میں یہ خواہش ڈال دی۔ مگر یہ خواہش تو درحقیقت انسانی روح میں موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انسانی رُوح درحقیقت خدا کی پیدا کردہ ہے۔
(چشمۂ مسیحی صفحہ ۳۹-۴۰)

واضح رہے کہ ارواح کا حادث اور مخلوق ہونا قرآن شریف میں بڑی بڑی اور قطعی دلائل سے بیان کیا گیا ہے چنانچہ برعایت ایجاز و اجمال چند دلائل ان میں سے نمونہ کے طور پر اس جگہ لکھے جاتے ہیں:۔

اول یہ بات بہ بداہت ثابت ہے کہ تمام روحیں ہمیشہ اور ہر حال میں خدائے تعالیٰ کی ماتحت اور زیرِ حکم ہیں اور بجز مخلوق ہونے کے اَور کوئی وجہ موجود نہیں جس نے روحوں کو ایسے کامل طور پر خدائے تعالیٰ کے ماتحت اور زیرِ حکم کر دیا ہو۔ سو یہ رُوحوں کے حادث اور مخلوق ہونے پر اوّل دلیل ہے۔

دوم یہ بات بھی بہ بداہت ثابت ہے کہ تمام روحیں خاص خاص استعدادوں اور طاقتوں میں محدود اور محصور ہیں۔ جیسا کہ بنی آدم کے اختلاف روحانی حالات و استعدادات پر نظر کر کے ثابت ہوتا ہے اور یہ تحدید ایک محدِّد کو چاہتی ہے جس سے ضرورت محدث کی ثابت ہو کر (جو محدِّد ہے) حدوث روحوں کا بپایۂ ثبوت پہنچتا ہے۔

سوم یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ تمام روحیں عجز و احتیاج کے داغ سے آلودہ ہیں اور اپنی تکمیل اور بقا کے لئے ایک ایسی ذات کی محتاج ہیں جو کامل اور قادر اور عالم اور فیاض مطلق ہو۔ اور یہ امر ان کی مخلوقیت کو ثابت کرنے والا ہے۔

چہارم یہ بات بھی ایک ادنیٰ غور کرنے سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہماری روحیں اجمالی طور پر ان سب متفرق الٰہی حکمتوں اور صنعتوں پر مشتمل ہیں جو اجرام علوی و سفلی میں پائے جاتے ہیں اسی وجہ سے دنیا باعتبار اپنے جزئیات مختلفہ کے عالم تفصیلی ہے اور انسان عالم اجمالی کہلاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ یہ عالم صغیر اور وہ عالم کبیر ہے۔ پس جبکہ ایک جزئی عالم کے بوجہ پائے جانے پُر حکمت کاموں کے ایک صانع حکیم کی صفت کہلاتی ہے تو خیال کرنا چاہیئے کہ وہ چیز کیونکر صنعت الٰہی نہ ہوگی جس کا وجود اپنے عجائبات ذاتی کے رو سے گویا تمام جزئیات عالم کی عکسی تصویر ہے۔ اور ہریک جزئی کے خواص عجیبہ اپنے اندر رکھتی ہے اور حکمت بالغہ ایزدی پر بوجہ اتم مشتمل ہے۔

ایسی چیز جو مظہر جمیع عجائبات صفت الٰہی ہے مصنوع اور مخلوق ہونے سے باہر نہیں رہ سکتی بلکہ وہ سب چیزوں سے اوّل درجہ پر مصنوعیت کی مُہر اپنے وجود پر رکھتی ہے اور سب سے زیادہ تر اور کامل تر صانع قدیم کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ سو اس دلیل سے روحوں کی مخلوقیت صرف نظری طور پر ثابت نہیں بلکہ درحقیقت اجلیٰ بدیہات ہے۔ ماسوا اس کے دوسری چیزوں کی اپنی مخلوقیت کا

علم نہیں مگر رُوحیں فطرتی طور پر اپنی مخلوقیت کا علم رکھتی ہیں - ایک جنگلی آدمی کی رُوح بھی اس بات پر راضی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود بخود ہے - اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے الست بربکم قالوا بلیٰ - یعنی روحوں سے مَیں نے سوال کیا کہ کیا مَیں تمہارا رب (پیدا کنندہ) نہیں ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں - یہ سوال وجواب حقیقت میں اس پیوند کی طرف اشارہ ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے قدرتی طور پر متحقق ہے جس کی شہادت رُوحوں کی فطرت میں نقش کی گئی ہے -

تتمہ جس طرح بیٹے میں باپ اور ماں کا کچھ کچھ حلیہ اور خُوبو پائی جاتی ہے اسی طرح روحیں جو خدائے تعالیٰ کے ہاتھ سے نکلی ہیں اپنے صانع کی سیرت و خصلت سے اجمالی طور پر کچھ حصہ رکھتی ہیں - اگرچہ مخلوقیت کی ظلمت و غفلت غالب ہو جانے کی وجہ سے بعض نفوس میں وہ رنگ الٰہی کچھ پھیکا سا ہو جاتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک رُوح کسی قدر وہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے - اور پھر بعض نفوس میں وہ رنگ بد استعمالی کی وجہ سے بدنما معلوم ہوتا ہے مگر یہ اس رنگ کا قصور نہیں بلکہ طریقۂ استعمال کا قصور ہے - انسان کی اصلی قوتوں اور طاقتوں میں سے کوئی بھی بُری قوت نہیں صرف بد استعمالی سے ایک نیک قوت بُری معلوم ہونے لگتی ہے - اگر وہی قوت اپنے موقعہ پر استعمال کی جائے تو وہ سراسر نفع رساں اور خیر محض ہے اور حقیقت میں انسان کو جسقدر قوتیں دی گئی ہیں وہ سب الٰہی قوتوں کے اظلال و آثار ہیں - جیسے بیٹے کی صورت میں کچھ کچھ باپ کے نقوش آجاتے ہیں ایسا ہی ہماری رُوحوں میں اپنے رب کے نقوش اور اس کی صفات کے آثار آگئے ہیں جن کو عارف لوگ خوب شناخت کرتے ہیں - اور جیسے بیٹا جو باپ سے نکلا ہے اس سے ایک طبعی محبت رکھتا ہے نہ بناوٹی - اسی طرح ہم بھی جو اپنے رب سے نکلے ہیں اس سے فی الحقیقت طبعی محبت رکھتے ہیں نہ بناوٹی اور اگر ہماری روحوں کو اپنے رب سے یہ طبعی و فطرتی تعلق نہ ہوتا تو پھر سالکین کو اس تک پہنچنے کے لئے کوئی صورت اور سبیل نہ تھی -

(سرمہ چشم آریہ صـ ۱۱۹-۱۲۱)

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی - یعنی مَیں نے روحوں کو پوچھا کہ کیا مَیں تمہارا پیدا کرنے والا نہیں تو تمام رُوحوں نے یہی جواب دیا کہ کیوں نہیں - اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ روحوں کی فطرت میں یہی منقش اور مرکوز ہے کہ وہ اپنے پیدا کنندہ کی قائل ہیں اور پھر بعض انسان غفلت کی تاریکی میں پڑ کر اور پلید تعلیموں سے متاثر ہو کر کوئی دہریہ بن جاتا ہے اور کوئی آریہ اور اپنی فطرت کے مخالف اپنے پیدا کنندہ سے انکار کرنے لگتے ہیں - ظاہر ہے کہ ہر شخص

اپنے باپ اور ماں کی محبت رکھتا ہے یہاں تک کہ بعض بچے ماں کے مرنے کے بعد مر جاتے ہیں۔ پھر اگر انسانی روحیں خدا کے ہاتھ سے نہیں نکلیں اور اس کی پیدا کردہ نہیں تو خدا کی محبت کا نمک کس نے ان کی فطرت پر چھڑک دیا ہے اور کیوں انسان جب اس کی آنکھ کھلتی ہے اور پردہ غفلت دور ہوتا ہے تو دل اس کا خدا کی طرف کھنچا جاتا ہے اور محبت الٰہی کا دریا اس کے صحن سینہ میں بہنے لگتا ہے۔ آخر ان روحوں کا خدا سے کوئی رشتہ تو ہوتا ہے جو اُن کو محبت الٰہی میں دیوانہ کی طرح بنا دیتا ہے۔ وہ خدا کی محبت میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ تمام چیزیں اس کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ عجیب تعلق ہے۔ ایسا تعلق نہ ماں کا ہوتا ہے نہ باپ کا۔ پس اگر بقول آریوں کے روحیں خود بخود ہیں تو یہ تعلق کیوں پیدا ہو گیا اور کس نے یہ محبت اور عشق کی قوتیں خدا تعالیٰ کے ساتھ روحوں میں رکھدیں۔ یہ مقام سوچنے کا مقام ہے۔ اور یہی مقام ایک سچی معرفت کی کنجی ہے۔

(چشمۂ معرفت ص۱۵۸-۱۵۹)

خدا نے جو انسان کو اپنی طرف بلایا ہے تو اسی لئے اس نے پہلے سے پرستش اور عشق کے مناسب حال قوتیں اس میں رکھ دی ہیں۔ پس وہ قوتیں جو خدا کی طرف سے ہیں۔ خدا کی آواز کو سن لیتی ہیں۔ اسی طرح جب خدا نے چاہا کہ انسان خدا کی معرفت میں ترقی کرے تو اُس نے پہلے سے ہی انسانی رُوح میں معرفت کے حواس پیدا کر رکھے اور اگر وہ پیدا نہ کرتا تو پھر کیونکر انسان اس کی معرفت حاصل کر سکتا تھا۔ انسان کی رُوح میں جو کچھ ہے دراصل خدا سے ہے اور وہ خدا کی صفات ہیں جو انسانی آئینہ میں ظاہر ہیں۔ ان میں سے کوئی صفت بُری نہیں بلکہ ان کی بداستعمالی اور اُن میں افراط تفریط کرنا بُرا ہے۔ شاید کوئی جلدی سے یہ اعتراض کردے کہ انسان میں حسد ہے بُغض ہے اور دوسری صفات ذمیمہ ہوتی ہیں پھر وہ کیونکر خدا کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ پس واضح رہے کہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں دراصل تمام انسانی اخلاق الٰہی اخلاق کا ظلّ ہیں کیونکہ انسانی رُوح خدا سے ہے لیکن کمی یا زیادتی یا بداستعمالی کی وجہ سے وہ صفات ناقص انسانوں میں مکروہ صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً حسد انسان میں ایک بہت بُرا خلق ہے۔ جو چاہتا ہے کہ ایک شخص سے ایک نعمت زائل ہو کر اس کو مل جائے لیکن اصل کیفیت حسد کی صرف اس قدر ہے کہ انسان اپنے کسی کمال کے حصول میں یہ روا نہیں رکھتا کہ اس کمال میں اس کا کوئی شریک بھی ہو۔

پس درحقیقت یہ صفت خدا تعالیٰ کی ہے جو اپنے تئیں ہمیشہ وحدہٗ لاشریک دیکھنا چاہتا ہے پس ایک قسم کی بداستعمالی سے یہ عمدہ صفت قابلِ نفرت ہو گئی ہے۔ ورنہ اس طرح پر یہ صفت مذموم نہیں

کہ کمال میں سب سے زیادہ سبقت چاہے اور روحانیت میں تفرد اور یکتائی کے درجہ پر اپنے تئیں دیکھنا چاہے۔
(نسیم دعوت صفحہ ۲۷-۲۸)

اور یہ کہنا کہ اگر رُوح مخلوق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ فنا بھی ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ رُوح **بیشک فنا پذیر ہے**۔ اِس پر دلیل یہ ہے کہ جو چیز اپنی صفات کو چھوڑتی ہے اس حالت میں اس کو فانی کہا جاتا ہے۔ اگر کسی دوا کی تاثیر بالکل باطل ہو جائے تو اس حالت میں ہم کہیں گے کہ وہ دوا مرگئی۔ ایسا ہی رُوح میں یہ امر ثابت ہے کہ بعض حالات میں وہ اپنی صفات کو چھوڑ دیتی ہے بلکہ اُس پر جسم سے بھی زیادہ تغیّرات وارد ہوتے ہیں۔ انہی تغیرات کے وقت کہ جب وہ رُوح کو اُسکی صفات سے دُور ڈال دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ رُوح مرگئی۔ کیونکہ موت اسی بات کا نام ہے کہ ایک چیز اپنی لازمی صفات کو چھوڑ دیتی ہے تب کہا جاتا ہے کہ وہ چیز مرگئی۔ اور یہی بھید ہے کہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں فقط اُنہیں انسانی روحوں کو بعد مفارقت دنیا زندہ قرار دیا ہے جن میں وہ صفات موجود تھے جو اصل غرض اور علّت غائی ان کی پیدائش کی تھی یعنی خدا تعالیٰ کی کامل محبت اور اُس کی کامل اطاعت جو انسانی رُوح کی جان ہے۔ اور جب کوئی رُوح خدا تعالیٰ کی محبت سے پُر ہو کر اور اس کی راہ میں قربان ہو کر دنیا سے جاتی ہے تو اُسی کو زندہ رُوح کہا جاتا ہے باقی سب مُردہ روحیں ہوتی ہیں۔ غرض رُوح کا اپنی صفات سے الگ ہونا یہی اُس کی **موت** ہے۔ چنانچہ حالتِ خواب میں بھی جب جسم انسانی مرتا ہے تو رُوح بھی ساتھ ہی مرجاتی ہے۔ یعنی اپنی صفاتِ موجودہ کو جو بیداری کی حالت میں تھیں چھوڑ دیتی ہے اور ایک قسم کی موت اُس پر وارد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خواب میں وہ صفات اس میں باقی نہیں رہتیں جو بیداری میں اس کو حاصل ہوتی ہیں۔ سو یہ بھی ایک قسم موت کی ہے۔ کیونکہ جو چیز اپنی صفات سے الگ ہو جائے اس کو زندہ نہیں کہہ سکتے۔ اکثر لوگ موت کے لفظ پر بہت دھوکا کھاتے ہیں **موت صرف معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ اپنی صفات سے معطّل ہونے کا نام بھی موت ہے** ورنہ جسم جو مرجاتا ہے بہرحال مٹی اس کی تو موجود رہتی ہے۔ اسی طرح رُوح کی موت سے بھی یہی مراد ہے کہ وہ اپنی صفات سے معطّل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عالمِ خواب میں دیکھا جاتا ہے کہ جیسے جسم اپنے کاموں سے بیکار ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی رُوح بھی اپنی ان صفات سے جو بیداری میں رکھتے تھے بکلّی معطّل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک زندہ کی رُوح کسی میت سے خواب میں ملاقات کرتی ہے اور نہیں جانتی کہ وہ میت ہے اور سونے کے ساتھ ہی بکلّی اس دنیا کو بھول جاتی ہے اور پہلا چولا اُتار کر نیا چولا پہن لیتی ہے۔ اور تمام علوم جو رکھتی تھی سب کے سب

بہ یکبارگی فراموش کر دیتی ہے اور کچھ بھی اس دنیا کا یاد نہیں رکھتی بجز اس صورت کے خدا یاد دلا دے ۔ اور اپنے تصرفات سے بکلّی معطّل ہو جاتی ہے اور سچ سچ خدا کے گھر میں جا پہنچتی ہے ۔ اور اس وقت تمام حرکات اور کلمات اور جذبات اسکے خدا تعالیٰ کے تصرفات کے نیچے ہوتے ہیں ۔ اور اس طور سے خدا تعالیٰ کے تصرّفات کے نیچے وہ مغلوب ہوتی ہے کہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ عالم خواب میں کرتی یا کہتی یا سنتی یا حرکت کرتی ہے وہ اپنے اختیار سے کرتی ہے بلکہ تمام اختیاری قوت اس کی مسلوب ہو جاتی ہے ۔ اور کامل طور پر موت کے آثار اس پر ظاہر ہوتے ہیں ۔ سو جسقدر جسم پر موت آتی ہے اس سے بڑھ کر رُوح پر موت وارد ہو جاتی ہے ۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت تعجب آتا ہے کہ وہ اپنی حالتِ خواب پر کبھی غور نہیں کرتے اور نہیں سوچتے کہ اگر رُوح موت سے مستثنیٰ رکھی جاتی تو وہ ضرور عالمِ خواب میں بھی مستثنیٰ رہتی ۔ ہمارے لئے خواب کا عالم موت کے عالم کی کیفیت سمجھنے کے لئے ایک آئینہ کے حکم میں ہے ۔ جو شخص رُوح کے بارے میں سچی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اسکو چاہیئے کہ خواب کے عالم پر بہت غور کرے کہ ہر ایک پوشیدہ راز موت کا خواب کے ذریعہ سے کھل سکتا ہے ۔ اگر تم عالم خواب کے اسرار پر جیسا کہ چاہیئے توجہ کرو گے اور جس طور سے عالمِ خواب میں رُوح پر ایک موت وارد ہوتی ہے اور اپنے علوم اور صفات سے وہ الگ ہو جاتی ہے اس طور پر نظر تدبّر ڈالو گے تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ موت کا معاملہ خواب کے معاملہ سے ملتا جُلتا ہے ۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رُوح مفارقت بدن کے بعد اسی حالت پر قائم رہتی ہے جو حالت دنیا میں وہ رکھتی تھی بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ایسی ہی موت اس پر وارد ہو جاتی ہے جیسا کہ خواب کی حالت میں وارد ہوئی تھی ۔ بلکہ وہ حالت اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور ہر ایک صفت اسکی نیستی کی چکّی کے اندر پیسی جاتی ہے اور وہی رُوح کی موت ہوتی ہے ۔ اور پھر جو لوگ زندہ ہونے کے کام کرتے تھے وہی زندہ کئے جاتے ہیں ۔ کسی رُوح کی مجال نہیں کہ آپ زندہ رہ سکے ۔ کیا تم اختیار رکھتے ہو کہ نیند کی حالت میں تم اپنی ان صفات اور حالات اور علوم کو اپنے قبضہ میں رکھ سکو جو بیداری میں تم کو حاصل ہیں؟ نہیں بلکہ آنکھ بند کرنے کے ساتھ ہی رُوح کی حالت بدل جاتی ہے اور ایک ایسی نیستی اس پر وارد ہوتی ہے کہ تمام کارخانہ اس کی ہستی کا اُلٹ پلٹ ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ رُوح کی موت کے بارے میں قرآن شریف میں فرماتا ہے ۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۔

(الجزو ۲۴ سورۃ الزمر) (ترجمہ) خدا جانوں کو جب انکی موت کا وقت آ جاتا ہے اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے ۔

یعنی وہ جانیں بے خود ہو کر الٰہی تصرّف اور قبضہ میں اپنی موت کے وقت آجاتی ہیں اور زندگی کی خود اختیاری اور خود شناسی ان سے جاتی رہتی ہے اور موت اُن پر وارد ہو جاتی ہے یعنی بکلّی وہ روحیں نیست کی طرح ہو جاتی ہیں اور صفاتِ حیات زائل ہو جاتی ہیں اور ایسی رُوح جو دراصل مرتی نہیں مگر مرنے کے مشابہ ہوتی ہے وہ رُوح کی وہ حالت ہوتی ہے کہ جب انسان سوتا ہے تب وہ حالت پیدا ہوتی ہے اور ایسی حالت میں بھی رُوح خدا تعالیٰ کے قبضہ اور تصرّف میں آجاتی ہے۔ اور ایسا تغیر اس پر وارد ہو جاتا ہے کہ کچھ بھی اس کی دنیوی شعور اور ادراک کی حالت اس کے اندر باقی نہیں رہتی۔ غرض موت اور خواب دونوں حالتوں میں خدا کا قبضہ اور تصرف رُوح پر ایسا ہو جاتا ہے کہ زندگی کی علامت جو خود اختیاری اور خود شناسی ہے بکلّی جاتی رہتی ہے۔ پھر خدا ایسی رُوح کو جس پر درحقیقت موت وارد کردی ہے واپس جانے سے روک رکھتا ہے اور وہ رُوح جس پر اُس نے درحقیقت موت وارد نہیں کی اسکو پھر ایک مقررہ وقت تک دنیا میں واپس کر دیتا ہے۔ اس ہمارے کاروبار میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو فکر اور سوچ کرنے والے ہیں۔

یہ ہے ترجمہ مع شرح آیت ممدوحہ بالا کا اور یہ آیت موصوفہ بالا دلالت کر رہی ہے کہ جیسے جسم پر موت ہے۔ روحوں پر بھی موت ہے لیکن قرآن شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ ابرار اور اخیار اور برگزیدہ لوگوں کی رُوحیں چند روز کے بعد پھر زندہ کی جاتی ہیں کوئی تین دن کے بعد کوئی ہفتہ کے بعد کوئی چالیس دن کے بعد اور یہ حیات ثانی نہایت آرام اور آسائش اور لذت کی اُن کو ملتی ہے۔

یہی حیات ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے نیک بندے اپنی پوری قوت اور پوری کوشش اور پورے صدق و صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں اور نفسانی تاریکیوں سے باہر آنے کیلئے پورا زور لگاتے ہیں اور خدا کی رضا جوئی کے لئے تلخ زندگی اختیار کرتے ہیں گویا مر ہی جاتے ہیں۔ غرض جیسا کہ آیت موصوفہ بالا بیان فرما رہی ہے۔ رُوح کو بھی موت ہے جیسا جسم کو اگرچہ اس عالم کی نہایت مخفی کیفیتیں اس تاریک دنیا میں ظاہر نہیں ہوتیں لیکن بلاشبہ عالم رویا یعنی خواب کا عالم اس عالم کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اور جو موت اس عالم میں رُوح پر وارد ہوتی ہے اس موت کا نمونہ عالم خواب میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ معاً آنکھ بند ہونے کے ساتھ ہی ہماری رُوح کی تمام صفات اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہیں۔ اور اس بیداری کا تمام سلسلہ فراموش ہو جاتا ہے اور تمام روحانی صفات اور تمام علوم جو ہماری رُوح میں تھے کالعدم ہو جاتے ہیں اور حالت خواب میں وہ نظارے رُوح کے ہمارے پیش نظر آجاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب وہ ہماری رُوح کچھ اَور ہی ہے اور تمام صفات اس کی جو بیداری میں تھے کھوئے گئے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی حالت ہے جو موت سے

مشابہ بلکہ ایک قسم کی موت ہے اور یہ قطعی اور یقینی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ موت جو جسم کی موت کے ساتھ رُوح پر وارد ہوتی ہے وہ ایسی موت کے ساتھ مشابہ ہے جو نیند کی حالت میں رُوح پر وارد ہوتی ہے مگر وہ موت اس موت کی نسبت بہت بھاری ہے۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۱۵۲-۱۵۶)

وہ اعتقاد جو قرآن شریف نے سکھایا ہے یہ ہے کہ جیسا کہ خدا نے ارواح کو پیدا کیا ہے ایسا ہی **وہ ان کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہے** اور انسانی رُوح اُس کی موہبت اور فضل سے ابدی حیات پاتی ہے نہ اپنی ذاتی قوت سے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنے خدا کی پوری محبت اور پوری اطاعت اختیار کرتے ہیں اور پورے صدق اور وفاداری سے اس کے آستانہ پر جھکتے ہیں ان کو خاص طور پر ایک کامل زندگی بخشی جاتی ہے اور ان کے فطرتی حواس میں بھی بہت تیزی عطا کی جاتی ہے اور اُن کی فطرت کو ایک نور بخشا جاتا ہے جس نور کی وجہ سے ایک فوق العادت روحانیت ان میں جوش مارتی ہے اور تمام رُوحانی طاقتیں جو دنیا میں رکھتے تھے موت کے بعد بہت وسیع کی جاتی ہیں اور نیز مرنے کے بعد وہ اپنی خداداد مناسبت کی وجہ سے جو حضرت عزّت سے رکھتے ہیں آسمان پر اُٹھائے جاتے ہیں جس کو شریعت کی اصطلاح میں رفع کہتے ہیں۔ لیکن جو مومن نہیں ہیں اور خدا تعالیٰ سے صاف تعلقات نہیں رکھتے یہ زندگی اُن کو نہیں ملتی اور نہ یہ صفات اُن کو حاصل ہوتی ہیں اس لئے وہ لوگ مُردہ کے حکم میں ہوتے ہیں۔ پس اگر خدا تعالیٰ رُوحوں کا پیدا کرنے والا نہ ہوتا تو وہ اپنے قادرانہ تصرف سے مومن اور غیر مومن میں یہ فرق دکھلا نہ سکتا۔

(چشمۂ مسیحی صفحہ ۵۳ حاشیہ)

قولہٗ۔ مرزا صاحب اور سب اہل اسلام کا یہی اعتقاد ہے اور قرآن میں آیا ہے کہ جب آنحضرت (محمد صاحب) سے لوگوں نے پوچھا کہ رُوح کیا چیز ہے تو آپ کچھ نہ بتلا سکے اور اس وقت آیت نازل ہوئی کہ اے محمد کہدے کہ رُوح ایک امرِ ربّی ہے۔ سو مسلمانوں نے تو رُوح کو کیا سمجھا ہوگا خدا نے اُن کے ہادی پر بھی رُوح کی کیفیت ظاہر نہیں کی اور خدا کا بھی کیا جواب عمدہ ہے کہ رُوح امرِ ربّی ہے کیا اَور چیزیں امرِ ربّی نہیں؟

اقول۔ .... لالہ صاحب! مَیں آپ کی غلطیوں کی کہاں تک اصلاح کرتا جاؤں۔ آپ نے یہ کس سے سُن لیا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم رُوح نہیں دیا گیا تھا اور آپ نے قرآن شریف میں کس جگہ اور کہاں

دیکھ لیا کہ حضرت ممدوح رُوح کے علم سے بے خبر تھے میں جانتا ہوں کہ آپ کو اپنی عقل ناتمام کی شامت سے اس آیت کے سمجھنے میں دھوکا لگا ہے جو قرآن شریف میں وارد ہے اور وہ یہ ہے:۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ (الجزء ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل) اور کفار تجھ سے (اے محمدؐ) پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا ہے۔ اور کس چیز سے اور کیونکر پیدا ہوئی ہے ان کو کہدے کہ رُوح میرے رب کے امر میں سے اور تم کو اے کافرو علم رُوح اور اسرار الٰہی نہیں دیا گیا مگر کچھ تھوڑا سا۔ سو اسجگہ اے ماسٹر صاحب آپ کو اپنے نقصان فہم سے یہ غلطی لگی کہ آپ نے اس عبارت کا مخاطب (کہ تم کو علم روح نہیں دیا گیا) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سمجھ لیا۔ حالانکہ لفظ مَآ اُوْتِيْتُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم کو نہیں دیا گیا جمع کا صیغہ ہے جو صاف دلالت کر رہا ہے جو اس آیت کے مخاطب کفّار ہیں ....

.... کفار کی ایک جماعت نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے رُوح کے بارے میں سوال کیا کہ رُوح کیا چیز ہے۔ تب ایسی جماعت کو جیسا کہ صورت موجودہ تھی بصیغہ جمع مخاطب کرکے جواب دیا گیا کہ **رُوح عالم امر میں سے ہے** یعنی **کلمۃ اللّٰہ یا ظلّ کلمہ ہے** جو بحکمت وقدرت الٰہی رُوح کی شکل پر وجود پذیر ہو گیا ہے اور اس کو خدائی سے کچھ حصّہ نہیں بلکہ وہ درحقیقت حادث اور بندۂ خدا ہے۔ اور یہ قدرت ربّانی کا ایک بھید دقیق ہے جس کو تم اے کافرو سمجھ نہیں سکتے مگر کچھ تھوڑا سا جس کی وجہ سے تم مکلّف بایمان ہو تمہاری عقلیں بھی دریافت کر سکتی ہیں ....

یہ جو خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ رُوح عالم امر میں سے ہے جس پر ماسٹر صاحب نے اپنی خوش فہمی سے جھٹ پٹ اعتراض بھی کر دیا۔ یہ ایک بڑی بھاری صداقت کا بیان ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ **ربوبیت الٰہی دو طور سے** ناپیدا چیزوں کو پیدا کرتی ہے اور دونوں طور کے پیدا کرنے میں پیدا شدہ چیزوں کے الگ الگ نام رکھے جاتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ کسی چیز کو اس طور سے پیدا کرے کہ اس چیز کا کچھ بھی وجود نہ ہو تو ایسے پیدا کرنے کا نام اصطلاح قرآنی میں **امر** ہے۔ اور اگر ایسے طور سے کسی چیز کو پیدا کرے کہ پہلے وہ چیز کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی ہو تو اس طرز کی پیدائش کا نام **خلق** ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ بسیط چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا **عالم امر** میں سے ہے اور مرکب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے متشکل کرنا **عالم خلق** سے ہے۔ جیسے اللہ تعالےٰ دوسرے مقام میں قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ یعنی بسائط کا عدم محض سے پیدا کرنا اور مرکبات کو ظہور خاص میں لانا دونوں خدا کا فعل ہیں اور بسیط

اور مرکب دونوں خدائے تعالیٰ کی پیدائش ہے۔ اب ماسٹر صاحب! دیکھا کہ یہ کیسی اعلیٰ اور عمدہ صداقت ہے جس کو ایک مختصر آیت اور چند محدود لفظوں میں خدائے تعالیٰ نے ادا کر دیا۔ اس کے مقابلہ پر اگر آپ وید کے عقیدہ کو سوچیں تو جتنا شرمندہ ہوں اتنا ہی تھوڑا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص۱۲۳-۱۲۹)

مَیں سچ سچ کہتا ہوں بالکل سچ جس میں ذرا مبالغہ کی آمیزش نہیں کہ قرآن شریف نے جس قدر خوبی اور عمدگی اور صفائی اور سچائی سے رُوحوں کے خواص اور اُن کی قوتیں اور طاقتیں اور استعدادیں اور ان کے دیگر کوائف عجیبہ بیان کئے ہیں اور پھر ان سب بیانات کا ثبوت دیا ہے وہ ایسا عالی اور باریک اور پُرحکمت بیان ہے اور ایسے کامل درجہ کی وہ صداقتیں ہیں کہ اگر وید کے چاروں رشی دوبارہ جنم لے کر بھی دنیا میں آویں اور جہاں تک ممکن ہو خوض اور فکر سے زور لگاویں تب بھی یہ مقام وسعت علمی اور یہ معارف عالیہ انہیں میسّر نہیں آ سکتے اگرچہ فکر کرتے کرتے مر ہی جاویں۔

(سرمہ چشم آریہ ص۱۸۶)

رُوحوں میں بہت سے خواص اور عجیب طاقتیں اور استعدادیں پائی جاتی ہیں جن کو قرآن شریف نے استیفاء سے ذکر کیا ہے۔ مثلاً اُن میں چند قوتیں اور استعدادیں یہ ہیں جو ہم ذیل میں لکھتے ہیں:-

(۱) علوم اور معارف کی طرف مشائق ہونے کی ایک قوت

(۲) علوم کو حاصل کرنے کی ایک قوت

(۳) علوم حاصل کردہ کے محفوظ رکھنے کی ایک قوت

(۴) محبت الٰہی کی ایک قوت

(۵) لذت وصال الٰہی اٹھانے کی ایک قوت

(۶) مکاشفات کی ایک قوت

(۷) مؤثر اور متاثر ہونے کے یا یوں کہو کہ باہم عامل اور معمول ہونے کی ایک قوت

(۸) تعلق اجسام قبول کرنے کی ایک قوت

(۹) تخلق باخلاق اللہ کی ایک قوت

(۱۰) مورد الہام الٰہی ہونے کی ایک قوت

(۱۱) بسطی اور قبضی حالت پیدا ہونے کی ایک قوت

(۱۲) معارف غیر متناہیہ کے قبول کرنے کی ایک قوت

(۱۳) رنگین برنگ تجلی الوہیت ہونے کی ایک قوت
(۱۴) عقلی قوت جس سے امتیاز حسن و قبح اُن پر ظاہر ہوتا ہے
(۱۵) ابقائے اثر و قبول اثر کی ایک قوت بمقابلہ اپنے اجسام متعلقہ کے
(۱۶) اقرار بوجود خالق حقیقی کی ایک قوت
(۱۷) اجسام کے ساتھ اور ان کے اشکال خاصہ کے ساتھ مل کر بعض نئے خواص کے ظاہر کرنے کی قوت
(۱۸) ایک قوت کشش باہمی جسکو مقناطیسی قوت کہنا چاہیئے۔
(۱۹) ابدی طور پر قائم رہنے کی ایک قوت۔
(۲۰) جسم مفارق کی خاک سے ایک خاص تعلق رکھنے کی قوت جو کشفی طور پر ارباب کشف قبور پر ظاہر ہوتی ہے۔
ایسا ہی اور بھی بہت سی ایسی قوتیں ہیں جن کا مفصل بیان نہایت لطافت اور خوبی سے قرآن شریف میں مندرج ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۹۷ - ۱۹۹)

تناسخ کے مسئلہ جیسا اور کوئی جھوٹا مسئلہ نہیں کیونکہ اس کی بنیاد بھی غلط ہے اور آزمائش کے طور پر بھی یہ غلط ثابت ہوتا ہے اور انسانی پاکیزگی کے لحاظ سے بھی غلط ٹھہرتا ہے اور خدا کی قدرت میں رخنہ انداز ہونے کی وجہ سے بھی ہر ایک عارف کا فرض ہے کہ اسکو غلط سمجھے۔

اس کی **بنیاد** اس طرح پر غلط ہے کہ ستیارتھ پرکاش میں بتلایا گیا ہے کہ رُوح عورت کے پیٹ میں اس طرح آتی ہے کہ شبنم کے ساتھ کسی ساگ پات پر پڑتی ہے اور اس ساگ پات کے کھانے سے رُوح بھی ساتھ ہی کھائی جاتی ہے۔ پس اس سے تو لازم آتا ہے کہ رُوح دو ٹکڑے ہو کر زمین پر پڑتی ہے ایک ٹکڑے کو اتفاقاً مرد کھا لیتا ہے اور دوسرے ٹکڑے کو عورت کھاتی ہے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ مسئلہ ہے کہ بچہ کو رُوحانی قوتیں اور روحانی اخلاق مرد اور عورت دونوں سے ملتے ہیں، نہ کہ صرف ایک سے پس دونوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے ساگ پات کو کھاویں جس میں رُوح ہو اور صرف ایک کا کھانا کافی نہیں۔ پس بہ بداہت یہ امر مستلزم تقسیم رُوح ہے اور تقسیم رُوح باطل ہے۔ اس لئے تناسخ باطل ہے۔

اور **آزمائش** کے طور پر یہ مسئلہ اس طرح پر غلط ٹھہرتا ہے کہ جس طرح ہر قسم کی روحیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان تمام صورتوں میں ممکن ہی نہیں کہ شبنم کے ساتھ وہ روحیں پیدا ہوتی ہوں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بالوں میں جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ وہ رُوحیں کس شبنم کے ساتھ کھائی جاتی ہیں؟ ایسا ہی

کنک کے کھاتوں میں سُسری پڑ جاتی ہے - وہ کروڑ ہا رُوحیں جو کھاتے کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں - وہ کس شبنم کے ساتھ کھاتے میں اُترتی ہیں؟ اور کون ان کو کھاتا ہے؟ ایسا ہی ہم دیکھتے ہیں کہ پیٹ میں کدّو دانے پیدا ہوتے ہیں اور کبھی کبھی دماغ میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں - اور طبعی علم کے تجربہ سے پانی کے ہر ایک قطرہ میں ہزارہا کیڑے ثابت ہوتے ہیں - یہ کس شبنم سے پڑتے ہیں؟ تجربہ بتلا رہا ہے کہ ہر ایک چیز میں ایک قسم کے کیڑے کا مادہ موجود ہے - پشمینہ میں بھی ایک قسم کا کیڑا لگ جاتا ہے - لکڑی میں بھی اناج میں بھی اور بعض پھلوں میں پھل کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہی کیڑا پیدا ہوتا ہے جیسا کہ گولر کا درخت وہ کس شبنم سے کیڑے آتے ہیں . . . .

دیکھو! **پاکیزگی** کے لحاظ سے بھی تناسخ کا مسئلہ کیسا خراب ہے - کیا جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے اس کے ساتھ کوئی فہرست بھی اندر سے نکلتی ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ لڑکی فلاں مرد کی ماں یا دادی یا ہمشیرہ ہے اس سے وہ شادی کرنے سے پرہیز کرے -

اور یہ تناسخ کا مسئلہ پرمیشر کی **قدرت** میں بھی سخت **رخنہ انداز** ہے - خدا وہ خدا ہے کہ چاہے تو ایک لکڑی میں جان ڈال دے - جیسا کہ حضرت موسیٰ کا عصا ایک دم میں لکڑی اور ایک دم میں سانپ بن جاتا تھا - مگر رُوحوں کے انادی ہونے کی حالت میں ہندوؤں کا پرمیشر ہرگز پرمیشر نہیں رہ سکتا - کیونکہ جو محض دوسروں کے سہارے سے اپنی خدائی چلا رہا ہے اس کی خدائی کی خیر نہیں وہ آج بھی نہیں اور کل بھی نہیں - اور یہ کہنا کہ تناسخ کا چکّر جو کئی ارب سال سے بموجب آریہ صاحبوں کے عقیدہ کے جاری ہے اس کا باعث گذشتہ پیدائشوں کے گناہ ہیں - یہ خیال طبعی علم کے تجربہ کے ذریعہ سے نہایت فضول اور لچر اور باطل ثابت ہوتا ہے - یہ ظاہر ہے کہ رُوحوں کی پیدائش میں بھی خدا تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو کبھی پیش و پس نہیں ہوتا - مثلاً برسات کے دنوں میں ہزارہا کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں - اور گرمی کے دنوں میں بکثرت مکھیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو کیا انہی دنوں میں ہمیشہ دنیا میں پاپ زیادہ ہوتے ہیں اور نہایت سخت گناہ کی وجہ سے انسانوں کو مکھیاں اور برسات کے کیڑے بنایا جاتا ہے؟ اسی طرح کے ہزارہا دلائل ہیں جن سے تناسخ باطل ہوتا ہے -

(نسیم دعوت ۷۵ تا ۸۷ حاشیہ)

یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے کہ **رُوح ایک لطیف نور** ہے جو اس جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے - پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اوّل مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے اور پھر نمایاں ہو جاتا ہے - اور ابتداءً اس کا خمیر نطفہ میں موجود ہوتا ہے

بیشک وہ آسمانی خدا کے ارادہ سے اور اس کے اذن اور اُس کی مشیت سے ایک مجہول الکنہ علاقہ کے ساتھ نطفہ سے تعلّق رکھتا ہے اور نطفہ کا وہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے۔ نہیں کہ سکتے کہ وہ نطفہ کی ایسی جزو ہے جیسا کہ جسم جسم کی جزو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ باہر سے آتا ہے۔ یا زمین پر گر کر نطفہ کے مادہ سے آمیزش پاتا ہے۔ بلکہ وہ ایسا نطفہ میں مخفی ہوتا ہے جیسا کہ آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے۔ خدا کی کتاب کا یہ منشا نہیں ہے کہ رُوح الگ طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے یا فضا سے زمین پر گرتی ہے اور پھر کسی اتفاق سے نطفہ کے ساتھ مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے بلکہ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ہم ایسا خیال کریں تو قانون قدرت ہمیں باطل پر ٹھہراتا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹)

ثابت شدہ واقعات یقینی اور قطعی طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ خود نطفہ مرد اور عورت کا بغیر اس کے کہ اُس پر شبنم کی طرح آسمان کی فضا سے رُوح گرے رُوح پیدا ہونے کی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب مرد اور عورت کا نطفہ باہم مل جاتا ہے تو وہ استعداد بہت قوی ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ استعداد بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب بچّہ کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور امر سے اُسی قالب میں سے رُوح پیدا ہو جاتی ہے یہ وہ واقعات ہیں جو مشہود اور محسوس ہیں۔ اسی کو ہم کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی ہوئی۔ کیونکہ ہم رُوح کو جسم اور جسمانی نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رُوح اسی مادہ میں سے پیدا ہوتی ہے جو بعد اجتماع دونوں نطفوں کے رحم مادر میں آہستہ آہستہ قالب کی صورت پیدا کرتا ہے اور اس مادہ کے لئے ضروری نہیں کہ ساگ پات کی کسی قسم پر رُوح شبنم کی طرح گرے اور اس سے رُوح کا نطفہ پیدا ہو بلکہ وہ مادہ گوشت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے خواہ وہ گوشت بکرے کا ہو یا مچھلی کا یا ایسی مٹی ہو جو زمین کی عمیق تہ کے نیچے ہوتی ہے جس سے مینڈکیں وغیرہ کیڑے کوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں بلاشبہ یہ خدا کی قدرت کا ایک راز ہے کہ وہ جسم میں سے ایک ایسی چیز پیدا کرتا ہے کہ وہ نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔ پس واقعاتِ موجودہ مشہودہ محسوسہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آسمان سے رُوح نہیں گرتی بلکہ یہ ایک نئی رُوح ہوتی ہے جو ایک مرکب نطفہ میں سے بقدرتِ قادر پیدا ہو جاتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ یعنی جب رحم میں قالب انسانی تیار ہو جاتا ہے تو پھر ہم ایک نئی پیدائش

سے اُس کو مکمل کرتے ہیں۔ یعنی ہم اس مادہ کے اندر سے جس سے قالب تیار ہؤا ہے رُوح پیدا کر دیتے ہیں
(چشمۂ معرفت صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

یہ بھی طبعی تحقیقاتوں سے ثابت ہے کہ تین سال تک انسان کا پہلا جسم تحلیل پا جاتا ہے اور اسکے قائم مقام دوسرا جسم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ یقینی امر ہے۔ جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ جب انسان کسی بیماری کی وجہ سے نہایت درجہ لاغر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مشتِ استخوان رہ جاتا ہے تو صحت یابی کے بعد آہستہ آہستہ پھر وہ ویسا ہی جسم تیار ہو جاتا ہے۔ سو اسی طرح ہمیشہ پہلے اجزاء جسم کے تحلیل پاتے جاتے ہیں اور دوسرے اجزاء اُن کی جگہ لیتے ہیں۔ پس جسم پر گویا ہر آن ایک موت ہے اور ایک حیات ہے۔ ایسا ہی جسم کی طرح رُوح پر بھی تغیرات وارد ہوتے رہتے ہیں اور اُس پر بھی ہر آن ایک موت اور ایک حیات ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ جسم کے تغیّرات ظاہر اور کھلے کھلے ہیں مگر جیسا کہ رُوح مخفی ہے ایسا ہی اُس کے تغیرات بھی مخفی ہیں **اور رُوح کے تغیرات غیر متناہی ہیں**۔ جیسا کہ قرآن شریف سے ظاہر ہے کہ رُوح کے تغیرات غیر محدود ہیں یہاں تک کہ بہشت میں بھی وہ تغیرات ہونگے۔ مگر وہ تغیرات رو بہ ترقی ہونگے اور رُوحیں اپنی روحانی صفات میں آگے سے آگے بڑھتی جائیں گی اور پہلی حالت سے دوسری حالت ایسی دُور اور بلند تر ہو جائیگی گویا پہلی حالت بہ نسبت دوسری حالت کے موت کے مشابہ ہوگی۔
(چشمۂ معرفت صفحہ ۱۵۹-۱۶۰)

جسمانی صدمات بھی عجیب نظارہ دکھاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوح اور جسم کا ایسا تعلق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں اس سے زیادہ اس تعلق کے ثبوت پر یہ دلیل ہے کہ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی ماں جسم ہی ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں رُوح کبھی اوپر سے نہیں گرتی بلکہ وہ ایک نور ہے جو نطفہ میں ہی پوشیدہ طور پر مخفی ہوتا ہے اور جسم کی نشو و نما کے ساتھ چمکتا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ رُوح اس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہو جاتی ہے جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ یعنی پھر ہم اس جسم کو جو رحم میں تیار ہؤا تھا ایک اَور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اَور خلقت اُس کی ظاہر کرتے ہیں جو رُوح کے نام سے موسوم ہے۔ اور خدا بہت برکتوں والا ہے اور ایسا خالق ہے جو کوئی اس کے برابر نہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ ہم اسی جسم میں سے ایک اَور

پیدائش ظاہر کرتے ہیں یہ ایک گہرا راز ہے جو رُوح کی حقیقت دکھلا رہا ہے اور ان نہایت مستحکم تعلّقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو رُوح اور جسم کے درمیان واقعہ ہیں۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۔)

سوال۔ رُوح کا تعلّق جو قبور سے بتلایا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے؟

فرمایا:۔ اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ ارواح کے تعلّق قبور کے متعلق احادیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے وہ بالکل سچ اور درست ہے۔ ہاں یہ دوسرا امر ہے کہ اس تعلق کی کیفیت اور کنہ کیا ہے؟ جس کے معلوم کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ البتہ یہ ہمارا فرض ہو سکتا ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ اس قسم کا تعلق قبور کے ساتھ ارواح کا ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی محال عقلی لازم نہیں آتا۔ اور اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے قانون قدرت میں ایک نظیر پاتے ہیں۔ درحقیقت یہ امر اس قسم کا ہے جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض امور کی سچائی اور حقیقت صرف زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے اور اس کو ذرا وسیع کر کے ہم یوں کہتے ہیں کہ **حقائق الاشیاء** کے معلوم کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے مختلف طریقے رکھے ہیں بعض خواص آنکھ کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں اور بعض صداقتوں کا پتہ صرف کان لگاتا ہے اور بعض ایسی ہیں کہ حسّ مشترک سے اُن کا سُراغ چلتا ہے اور کتنی ہی سچّائیاں ہیں کہ وہ مرکز قویٰ یعنی دل سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض اللہ تعالےٰ نے صداقت کے معلوم کرنے کے لئے مختلف طریق اور ذریعے رکھے ہیں .... انسان بڑے قویٰ لے کر آیا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں اس کی تکمیل کے لئے ہر ایک قوّت کے سپرد ہیں۔ **نادان فلسفی** ہر بات کا فیصلہ اپنی عقل خام سے چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط محض ہے۔ تاریخی امور تو تاریخ ہی سے ثابت ہونگے۔ اور خواص الاشیاء کا تجربہ بدوں تجربہ صحیحہ کے کیونکر لگ سکیگا۔ امور قیاسیہ کا پتہ عقل دے گی۔ اِسی طرح پر متفرق طور پر الگ الگ ذرائع ہیں انسان دھوکہ میں مبتلا ہو کر حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے سے تب ہی محروم ہو جاتا ہے جب کہ وہ ایک ہی چیز کو مختلف امور کی تکمیل کا ذریعہ قرار دے لیتا ہے۔ مَیں اس اصول کی صداقت پر زیادہ کہنا ضروری نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ذرا سی فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آجاتی ہے اور روزمرّہ ہم ان باتوں کی سچائی کو دیکھتے ہیں۔ پس جب رُوح جسم سے مفارقت کرتی ہے یا تعلق پکڑتی ہے تو ان باتوں کا فیصلہ عقل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو فلسفی اور حکماء ضلالت میں مبتلا نہ ہوتے۔ اِسی طرح پر قبور کے ساتھ جو تعلق ارواح کا ہوتا ہے یہ ایک صداقت تو ہے

گر اس کا پتہ دینا اس آنکھ کا کام نہیں یہ **کشفی آنکھ** کا کام ہے کہ وہ دکھلاتی ہے۔ اگر محض عقل سے اس کا پتہ لگانا چاہو تو کوئی عقل کا پُتلا اتنا ہی بتلائے کہ رُوح کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ ہزار اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں اور ہزارہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں جو منکر ہیں۔ اگر نِری عقل کا یہ کام تھا تو پھر اختلاف کا کیا کام؟ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے تو مَیں نہیں کہہ سکتا کہ زید کی آنکھ تو سفید چیز کو دیکھے اور بکر کی ویسی ہی آنکھ اس سفید چیز کا ذائقہ بتلائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نِری عقل رُوح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلا سکتی۔ چہ جائیکہ اس کی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو رُوح کو ایک سبز لکڑی کی طرح مانتے ہیں اور روح فی الخارج اُن کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ تفاصیل رُوح کے وجود اور اس کے تعلق وغیرہ کی **چشمۂ نبوت** سے ملی ہیں اور نِرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے۔ تو یاد رکھو کہ انہوں نے منقولی طور پہ چشمۂ نبوت سے کچھ لے کر کہا ہے۔ پس جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رُوح کے متعلق علوم چشمۂ نبوت سے ملتے ہیں تو یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اسی چشمہ سے دیکھنا چاہیئے اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے کہ اس تودۂ خاک سے رُوح کا ایک تعلق ہوتا ہے۔ اور السلام علیکم یا اھل القبور کہنے سے جواب ملتا ہے۔ پس جو آدمی ان قویٰ سے کام لے جن سے کشف قبور ہو سکتا ہے وہ ان تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔ ....

قبور کے ساتھ تعلق ارواح کے دیکھنے کے لئے **کشفی قوت اور حِسّ** کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی کہے یہ ٹھیک نہیں ہے تو وہ غلط کہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی ایک کثیر تعداد کروڑہا اولیاء و صلحاء کا سلسلہ دنیا میں گذرا ہے اور مجاہدات کرنے والے بے شمار لوگ ہو گذرے ہیں۔ اور وہ سب اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔ گو اس کی اصلیت اور تعلقات کی وجہ عقلی طور پر ہم معلوم کر سکیں یا نہ مگر نفس تعلق سے انکار نہیں ہو سکتا۔ غرض کشفی دلائل ان ساری باتوں کا فیصلہ کئے دیتے ہیں۔ کان اگر نہ دیکھ سکیں تو ان کا کیا قصور؟ وہ اور قوت کا کام ہے۔ **ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں** کہ رُوح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔ انسان میت سے کلام کر سکتا ہے۔

رُوح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے۔ مَیں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک ثابت شدہ صداقت ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اسکی گواہی موجود ہے۔

یہ مسئلہ عام طور پر مسلّمہ مسئلہ ہے بجز اس فرقہ کے جو نفی بقائے رُوح کرتا ہے۔ اور یہ امر کہ کس جگہ تعلق ہے کشفی قوت خود ہی بتلا دیگی۔

(ملفوظات جلد اوّل صفحہ ۲۷۶ - ۲۸۰)

رُوح کوئی مکانی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے تعلقات مجہول الکنہ ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد ایک تعلّق رُوح کا قبر کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور **کشف قبور** کے وقت ارباب مکاشفات پر وہ تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب قبور اپنی اپنی قبروں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں بلکہ ان سے صاحب کشف کے مخاطبات و مکالمات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ بات احادیث صحیحہ سے بھی بخوبی ثابت ہے۔ صلوٰۃ فی القبر کی حدیث مشہور ہے اور احادیث سے ثابت ہے کہ مُردے جوتی کی آواز بھی سُن لیتے ہیں اور السّلام علیکم کا جواب دیتے ہیں۔ باوجود اس کے ایک تعلّق اُن کا آسمان سے بھی ہوتا ہے۔ اور اپنے نفسی نقطہ کے مکان پر اُن کا تمثّل مشاہدہ میں آتا ہے۔ اور انکا رفع مختلف درجات سے ہوتا ہے۔ بعض پہلے آسمان تک رہ جاتے ہیں۔ بعض دوسرے تک بعض تیسرے تک لیکن موت کے بعد رفع رُوح بھی ضرور ہوتا ہے جیسا کہ حدیث صحیح اور آیت ولا تفتح لھم ابواب السماء۔ پ۸ - صریح اشارہ کر رہی ہے۔ لیکن ان کا آسمان پر ہونا یا قبروں میں ہونا ایک مجہول الکنہ امر ہے۔

(الحق مباحثہ دہلی صفحہ ۸۵)